قرآن میں دعوت و تبلیغ

تقاضے اور طریقہ کار

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی

(دوسری اور آخری قسط)

استغفار داعی حق کی اہم خصوصیت ہے۔ یہ دعوت کی راہ کا وہ قیمتی سرمایہ ہے جو داعی کے اندر عجز و انکساری پیدا کرنے کا سبب اور رجوع الی اللہ یا تعلق باللہ کی راہیں ہموار کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ دعوت کا کام بلاشبہ بڑا ہی شرف و عظمت کا حامل ہے لیکن یہ زعم کہ اس منصب جلیل پر فائز ہونے سے وہ خالق حقیقی کی تمام نعمتوں کا مستحق بن جاتا ہے اور اس کا شمار مقربین الی اللہ کی فہرست میں ہو جاتا ہے' شیطانی وسوسہ ہے۔ اس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ یہ اہل کتاب کا شیوہ تھا کہ اپنی قوم میں انبیا کی بعثت کے مقدس سلسلے کی بنا پر اپنے آپ کو تمام تر خدائی نوازشوں کا حق دار سمجھتے تھے اور نحن ابناء اللّٰہ کا دعویٰ کرتے تھے۔ مشرکین مکہ بھی اسی بات پر فخر کرتے تھے کہ فوز و فلاح دراصل انھی کی تقدیر میں ہے جب ہی تو مال و دولت اور اولاد جیسی نعمتوں سے اسی دنیا میں نواز دیا گیا ہے۔ (السبا ۳۴: ۳۵) اور جہاں تک آخرت میں ابدی مسرتوں کے حصول کا تعلق ہے تو' اولاً یہ بات ہی مشکوک ہے اور اگر اس زندگی کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو وہ اپنے سفارشیوں کے ذریعے وہاں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

داعی کی ذمہ داری کسی بھی معاشرے میں غیر معمولی ہوتی ہے۔ بحیثیت انسان اس سے خطاؤں اور لغزشوں کا صدور ممکن ہوتا ہے خواہ دعوتی زندگی کے مرحلے میں ہو یا اپنی انفرادی و شخصی زندگی کے امور و مہمات میں ہو۔ جو جتنا زیادہ اپنے خدا کا محبوب ہوتا ہے' ابلیس کی سرگرمیاں اس کے ساتھ اتنی ہی بڑھی ہوئی ہوتی ہیں اور اس کے بھٹکنے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے خواہ خوشی و مسرت کا موقع ہو یا حزن و ملال کا' فوز و فلاح کی نعمت سے لطف اندوز ہونے کے لمحات ہوں یا ناکامی اور یاس و قنوطیت کے مظاہر سے سابقہ پڑا ہو' دعوت حق کے مثبت اثرات کی وجہ سے حلقہ احباب کا دائرہ وسیع ہو رہا ہو یا مخاطب کی ضد و ہٹ

دھرمی اور عناد و سرکشی کی وجہ سے بظاہر دعوت حق دلوں کو مسخر نہ کر پا رہی ہو اور افرادی قوت پر جمود طاری ہو گیا ہو، غرضیکہ ہر نرم و گرم اور خشک و تر حالات میں توبہ و استغفار کا دامن نہ چھوڑنا ہی داعی کے شایان شان ہے کیونکہ اس سے اللہ عزوجل کی تائید و نصرت اور اس کے نتیجے میں دونوں جہاں کی فیوض و برکات کا خزینہ ہاتھ آتا ہے۔ اس رجوع الی اللہ کی تعلیم وقت کے ہر پیغمبر نے اپنی قوم کو دی اور یقین دہانی کرائی کہ اس کے عوض آخرت کی ابدی اور حتمی زندگی کی لازوال مسرتوں کے علاوہ دنیا کی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت سے بھی مخلص داعی حق کو نوازا جاتا ہے۔ (ہود ۱۱:۵۲، ۶۱، ۹۰، حم السجدہ ۴۱:۶، نوح ۷۱:۱۱-۱۲)

ہادی اعظمؐ کی ۶۳ سالہ حیات طیبہ دنیائے انسانیت کے لیے اس باب میں بھی بہترین نمونہ ہے۔ قرآن کے مالک نے اس داعی اعظمؐ سے بھی رجوع الی اللہ کا مطالبہ کیا اور اپنے محبوب ترین رسول کے ذریعے بندگان خدا کو یہ پیغام دیا، وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا (ہود ۱۱:۳)، "اور یہ کہ تم اپنے رب سے توبہ و استغفار کرو، وہ تمھیں ایک مدت خاص تک متاع حسن سے نوازے گا"۔ آپؐ دنیائے انسانیت کے عظیم ترین نمائندہ اور اپنے خالق کے سب سے زیادہ چہیتے بندے اور رسولؐ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی سیرت کی سند خود مالک حقیقی نے دی، وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم ۶۸:۴)، "اور بلاشبہ تم عظیم ترین اخلاق کے درجے پر ہو"۔ اور فرما دیا: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۳۳:۲۱)، "تم لوگوں کے لیے نبی کریمؐ کی زندگی میں ایک بہترین نمونہ ہے"۔

دعوت اسلامی کی تاریخ شاہد ہے کہ جب دشوار گزار مراحل کے بعد حلقہ اسلام میں لوگوں کی جوق در جوق شمولیت ہو رہی تھی، اس موقع پر بھی آپؐ کو اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۔ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ کی روشنی میں خالق دوجہاں کی تسبیح اور مغفرت طلبی کی تلقین فرمائی جاتی ہے۔ داعی اعظمؐ نے اسی لیے عالم انسانیت کو بالعموم اور امت مسلمہ کو بالخصوص اپنی دانستہ اور نادانستہ خطاؤں پر اظہار ندامت اور استغفار کی تاکید کی۔ سب سے زیادہ محبوب و برگزیدہ ہونے کے باوجود آپؐ کا یہ معمول تھا کہ توبہ و استغفار سے بے اعتنائی نہیں برتی بلکہ احادیث سے پتا چلتا ہے کہ آپؐ تادم آخر توبہ و استغفار میں مصروف رہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک روایت منقول ہے کہ آپؐ فرماتے تھے واللّٰہ انی لا ستغفر اللّٰہ واتوب الیہ فی الیوم اکثر من سبعین مرۃ (الصحیح للبخاری ج ۲ کتاب الدعوات، ص ۹۳۳)، "خدا کی قسم دن بھر میں ستر سے زائد بار اللہ تعالیٰ سے (اپنی خطاؤں اور لغزشوں کی) مغفرت چاہتا ہوں اور اس کی طرف رجوع کرتا ہوں"۔

توبہ و استغفار کے باب میں قرآن اور صاحب قرآن کی تعلیمات امت مسلمہ کے ہر ہر فرد کے لیے نقوش راہ ہیں جن کے مطابق خود داعی کی سیرت مخاطبین کے حلقے میں عزو شرف کا موجب بن جاتی ہے اور

دعوت کے فروغ و اشاعت میں خدا کی برکتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ایسے ہی صالح نفوس کو اللہ تعالیٰ اپنی معیت و سرپرستی کی یقین دہانی کراتا ہے، وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ - اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران ۳:۱۵-۱۶)، "اور اللہ ان بندوں پر نگاہ رکھتا ہے جو کہتے ہیں کہ آقا! ہم ایمان لائے، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتش دوزخ سے بچالے"۔

دعوت حق اسی وقت برگ و بار لا سکتی ہے جب ایک طرف داعیانہ اوصاف و مطالبات سے اپنے آپ کو آراستہ کر لیا جائے اور دوسری طرف حکمت و دانائی کی متاع گراں حاصل کر لی جائے۔ تعلق باللہ، اخلاص وللّٰہیت، صبر و استقامت، ہٹ دھرموں سے اعراض اور توبہ و استغفار، وہ مطلوبہ اوصاف ہیں جن سے داعی کی پاک شخصیت منظر عام پر آجاتی ہے اور وہ حلقہ مخاطبین میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ حکمت و دانائی سے عاری ہو کر بسااوقات وہ اپنی شخصیت کو داغ دار کر لیتا ہے اور دعوت حق کی عظمت و تقدس کی پامالی کا سبب بن جاتا ہے۔ حکیمانہ انداز داعی کی پیش کردہ دعوت کو زیادہ پر تاثیر بنا دیتا ہے اور اس کی بدولت بعض مشکل ترین مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے حکمت و دانش مندی دعوت حق کے فروغ اور اس کی قبولیت کا دائرہ وسیع کرنے میں بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔ قرآن میں اسے ایک بہت بڑی دولت قرار دیا گیا ہے۔ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرہ ۲:۲۶۹)، "اور جس کو حکمت ملی، اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی"۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری انجام دینے والے معزز بندوں کو ہدایت کرتا ہے: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل ۱۶:۱۲۵)۔

حکمت عملی متعدد تقاضوں پر مشتمل ایک جامع لفظ ہے جن میں ایک یہ ہے کہ مخاطب کو قول بلیغ اور قول لین سے خطاب کیا جائے۔ داعی کی زبان میں اگر اثر آفرینی و دل نشینی کا وصف معیار مطلوب تک پایا جاتا ہو تو خوش آیند نتائج کی توقع یقین کی حد تک بڑھ جاتی ہے۔

چونکہ عوام و خواص دونوں ہی اس دعوت کے مخاطب ہوتے ہیں اس لیے داعی کو اختصار اور طوالت، جہاں جس چیز کی ضرورت ہو، استعمال کرنا چاہیے۔ مدعو کے ماحول اور اس کے حالات کا علم، اس کے مبلغ علم کا خیال، ضرورت کے مطابق امور و معاملات میں شرح و بسط کا طریقہ اختیار کرنا یا ایجاز و اختصار کے ساتھ دعوت کے متعلقہ پہلوؤں کی وضاحت کرنا اور دل نشین پیرایہ بیان اختیار کرنا سب اسی قول بلیغ کا حصہ ہیں جس کی داعی کو تلقین کی جاتی ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا (النساء ۴:۶۳)، "جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اسے اللہ جانتا ہے۔ ان سے تعرض مت کرو انھیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دل میں اتر جائے"۔

دعوت کا اصل مقصد مدعو کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کرنا ہے۔ جتنا موثر اور دل نشیں پیرایہ بیان

اختیار کیا جائے گا اتنا ہی اس کا حصول آسان ہو جائے گا۔ داعی کے دل میں یہ خیال کہ مخاطب مانے یا نہ مانے میرا اجر میرے خدا کے پاس محفوظ ہے' داعی کی خود غرضی ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف قول بلیغ کے حکم سے انحراف بھی ہے۔ بلاشبہ داعی داروغہ یا وکیل نہیں ہے کہ جیسے بھی ہو اس سے اپنی بات منوا لے اور اس کو اپنی زندگی کا رخ موڑ دینے پر مجبور کر دے یہ دعوت کی عظمت و وقار کے خلاف بھی ہے اور داعی کی شان کے خلاف بھی۔ لیکن یہ تو داعی کا فرض ہے کہ وہ دعوت اور مدعو سے متعلق تمام احوال و کوائف کے پیش نظر اقدام کرے اور حکمت کے ساتھ دعوت پہنچائے۔

دعوت و تبلیغ کا کام کسی مخصوص معاشرے یا ملک میں ہی نہیں ہوتا بلکہ پوری انسانی برادری اللہ کی اس عظیم نعمت کی مخاطب ہے۔ اس لیے ہمیں اقوام عالم کی زبانوں اور علوم و معارف سے بھی شناسائی حاصل کرنی ہو گی۔ ہم خواہ کسی بھی ملک میں رہتے بستے ہیں' ایک بڑی اکثریت ایسے مخاطبین کی بھی ہوتی ہے جو ہماری دعوت کی زبان تک نہیں سمجھتے۔ اس لیے فریضہ حق کی ادائیگی کے لیے کم از کم مدعو یا مخاطب معاشرے کی زبان سمجھنا پڑے گی اور ان پر دعوت کو کارگر اور موثر بنانے کے لیے وقت کے چیلنج کے مطابق اپنے مبلغ علم کو بڑھانا ہو گا۔ ایک داعی جو مدعو کی زبان میں معاملات کو واضح کر رہا ہو' وہ اللہ کی نگاہ میں ان پڑھ داعی کے مقابلے میں زیادہ محبوب ہے۔ وقت کی زبان میں اور پڑھے لکھے انداز میں دین کی دعوت پیش کرنے سے ماحول اور معاشرے میں ذہنی و فکری انقلاب تو آتا ہی ہے لیکن اس کے نتیجے میں جو شخص دعوت حق کو قبول کرتا ہے' وہ بھی ذہن و فکر کے لحاظ سے پختہ و مستحکم ہو جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی لالچ یا کسی مخلوق کا کوئی خوف اس کے قدموں میں لغزش پیدا نہیں کر سکتا۔ مزید برآں داعی کی شخصیت معاشرے میں اور بھی زیادہ محبوب بن جاتی ہے۔ اسلام کی دعوت بیسویں صدی کی زبان میں پیش کر دینے کے نتیجے میں ہدایت کی پیاسی دنیا اسلام کے چشمہ صافی سے سیراب ہونے کے لیے دوڑے گی۔

•• نرم گفتگو یا شیریں کلامی بھی جسے قرآن "قول لین" سے تعبیر کرتا ہے' ایک اعلیٰ جوہر ہے جو قول بلیغ کے ہی ضمن میں آتا ہے۔ یہ وصف مدعو کے قلب و ضمیر پر دیرپا نقش ثبت کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ داعی اور مدعو کے اعتقاد و عمل کا اختلاف دونوں کو دو مختلف سمتوں میں کھڑا کر دیتا ہے۔ داعی اپنے فکر و نظر اور عمل سے عشق رکھتا ہے اور مدعو بھی اپنے اعتقاد و عمل کو عزیز رکھتا ہے۔ لیکن دعوت داعی کا فرض منصبی ہے۔ اس لیے تصادم کے جذبات کو بالائے طاق رکھ کر مدعو کو دعوت حق سے روشناس کرانا خود اس کے وجود کے لیے لازمی ہے۔ اس لیے یہاں داعی کو جذباتیت کے بجائے نرمی و متانت سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔

قرآن میں متعدد مقامات پر موسیٰؑ و فرعون کے واقعات بیان کیے گئے ہیں جو دعوت و تبلیغ کے مراحل

میں راہ نما نقوش کا کام کرتے ہیں۔ فرعون نے خالق حقیقی کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ بحر و بر اور خشکی و تری کو اپنی منحوس اور ناپاک حرکتوں سے بھر دیا اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا یہاں تک کہ اپنے آپ کو ربوبیت کے منصب پر لا کھڑا کیا۔ تب وقت کے پیغمبر حضرت موسیٰؑ کو اپنے بھائی کی معیت میں فرعون تک دعوت حق پہنچانے کا حکم صادر ہوتا ہے لیکن یہ حکم بھی دیا جاتا ہے کہ شدت و سختی اور جوش و گرمی کے بجائے نرم مزاجی، متانت و سنجیدگی اور شیریں بیانی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ موسیٰؑ و ہارونؑ کو ربانی ہدایات ملتی ہیں، اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ - اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى - فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ ۲۰:۴۲-۴۴) "تو اور تیرا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ جا اور دیکھو تم لوگ میری یاد میں کوتاہی نہ کرنا۔ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے"۔

موسیٰؑ و فرعون کے واقعے کو قرآن نے متعدد مقامات پر بیان کر کے رسول اکرمؐ کو ماضی کی تاریخ سے روشناس کرایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اگر آپؐ کی دعوت حق کے بالمقابل ابولہب، ابوجہل، عتبہ، ولید اور دوسرے علم برداران کفر سرگرم عمل ہو کر آپؐ کو اور آپؐ کی دعوت کو زک پہنچانے کی سازشیں کر رہے ہیں تو کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے۔ پیغمبر اور ان کے اہل ایمان رفقا پر مظالم و شدائد کے ایسے سخت پہاڑ توڑے گئے کہ انھیں متی نصر اللہ کی آواز بلند کرنا پڑی۔ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ - مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (البقرہ ۲:۲۱۴) "حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی"۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مکہ میں آپؐ نے سربراہان کفر و شرک سے معاہدہ نہیں کیا اور نہ ہی شرک و بت پرستی کی لعنتوں میں گرفتار زعماے قریش اور دوسرے اساطین عرب سے دعوت و تبلیغ کے معاملے میں گریز اختیار کیا۔ حکمت و دانائی کی بیش بہا دولت سے متمتع ہوتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے قول: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ کے دل میں بسا لینے کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ آپؐ قوم کے معززین سے سخت و سست انداز میں گویا ہوتے۔ چنانچہ آپؐ نے انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر، عمومی نشستوں میں بھی اور خصوصی نشستوں میں بھی سرداران قریش اور دیگر زعماے عرب کے سامنے دعوت دین پیش کی لیکن ایک مثالی داعی کا کردار کبھی فراموش نہ کیا۔ آج لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں ایسے لوگ ہیں جن تک دین کی دعوت نہیں پہنچائی گئی ہے۔ اگر دعوت کی مبارک کوشش کا آغاز ہوتا بھی ہے تو مباحثہ و مناقشہ، سختی و شدت پر منتج ہو

جاتی ہے۔ نتیجتاً داعی مدعو کے قلب و ضمیر پر خوش آیند نقوش نہیں چھوڑ پاتا اور بسااوقات دعوت دین سے متنفر کرنے کا محرک بن جاتا ہے۔ ادع الی سبیل ربک الایہ کے تحت ایک معروف عالم دین کی وضاحت قابل توجہ ہے:

"اس میں اللہ کی خاص صفت ربوبیت اور پھر اس کی نبی کریمؐ کی طرف اضافت میں اشارہ ہے کہ دعوت کا کام صفت ربوبیت اور تربیت سے تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح حق تعالیٰ نے آپ کی تربیت فرمائی' آپ کو بھی تربیت کے انداز سے دعوت دینا چاہیے۔ خود لفظ دعوت بھی اس مفہوم کو ادا کرتا ہے کہ پیغمبر کا کام صرف اللہ کے احکام پہنچا دینا اور سنا دینا نہیں بلکہ لوگوں کو ان کی تعمیل کی طرف دعوت دینا ہے اور ظاہر ہے کہ کسی کو دعوت دینے والا' اس کے ساتھ ایسا خطاب نہیں کرتا جس سے مخاطب کو نفرت و وحشت ہو" (مفتی محمد شفیع' معارف القرآن' ج ۵' ص ۴۰۸)۔

قرآنی آیات کی روشنی میں حکمت کے تحت داعی حق کے لیے جو دوسرا اصول مستنبط ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ مدعو کی نفسیات کو ملحوظ رکھا جائے۔ معاشرے کے معزز و محترم لوگوں کو خطاب اس بھونڈے انداز سے نہ ہو کہ ان کی عزت نفس کو دھچکا لگے۔ داعی کو اپنی دعوت ایسے موقع پر پیش کرنے سے احتراز کرنا چاہیے جب مدعو دوسری قسم کی دلچسپیوں اور ضرورتوں میں مصروف و منہمک ہو۔ مخاطب کی صلاحیت و لیاقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے دل نشیں پیرایہ بیان اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اہل علم اور عوام دونوں قسم کے مخاطبین کو الگ الگ انداز سے دعوت دی جائے گی۔ بے جا تکرار اور طول بیانی بعض اوقات داعی اور دعوت سے متعلق منفی اثرات کے محرک بنتے ہیں۔ اس لیے اس طریقہ تبلیغ سے گریز کرنا بھی داعی کی حکمت عملی میں شامل ہے۔ مدعو خواہ اہل ثروت طبقے سے تعلق رکھتا ہو یا فقرا و مساکین کی جماعت سے' ہر ایک عزت نفس رکھتا ہے۔ اس لیے اس بات کا خیال کرنا چاہیے کہ طریقہ تبلیغ سے اس کی ذلت و رسوائی نہ ہو۔ یہ ساری شقیں مخاطب کی نفسیات سے متعلق ہیں جو داعی کے لیے دعوت و تبلیغ کے مراحل میں توشہ راہ بن سکتی ہیں۔

اگر دعوت کے مخاطبین وہ لوگ ہوں جن کے دل وحدت الٰہ کی بجائے معبودان باطل کا مسکن بنے ہوں تو داعی کو معبودان باطل اور ان کے عقیدت مندوں پر لعن و طعن سے گریز کرتے ہوئے مدعا و مقصود کو پیش کرنا چاہیے۔ قرآن اس سلسلے میں داعیان حق کو تنبیہ کرتا ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام ۶:۱۰۸)' "اور (اے مسلمانو) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں' انھیں گالیاں نہ دو' کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں"۔
قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مدعو کی نفسیات کے لحاظ کی مثالیں ملتی ہیں۔ خالق کائنات کے وجود سے متعلق

عقلی استدلال کے بعد قرآن کا یہ تبصرہ ملاحظہ ہو: ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (الزمر ۳۹: ۶) "یہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمھارا رب ہے، بادشاہی اسی کی ہے، کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے، پھر تم کدھر سے پھرائے جا رہے ہو؟" پھر یہ کہنے کے بجائے کہ تم کہاں بھٹک رہے ہو یا تمھارے معبودوں نے ان حقائق کے باوجود تم کو کیوں بھٹکا دیا ہے، یہ کہا جا رہا ہے کہ آخر ان ساری حقیقتوں کے باوجود تم کہاں پھرائے جا رہے ہو۔ اس لطیف پیرایہ بیان میں نہ مدعو کی ذہنیت پر چوٹ کی جا رہی ہے اور نہ مخاطب کے معبودان باطل پر کوئی حملہ کیا جا رہا ہے۔ یہ نکتہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ گمراہ کرنے والے کچھ لوگ یقیناً ہیں اور اب یہ فیصلہ کرنا خود اس کا کام ہے کہ وہ ٹھنڈے دل سے سوچے کہ اسے صراط مستقیم سے پھیرنے میں کون لوگ اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ قرآن میں حکمت عملی کے اس پہلو کو متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ (الانعام ۶: ۹۵، یونس ۱۰: ۳-۴، فاطر ۳۵: ۳، یونس ۱۰: ۳۴) سید مودودیؒ اس طریقہ دعوت کی حکمت پر گویا ہیں:

"خیال رہے کہ خطاب عام لوگوں سے ہے اور ان سے سوال یہ نہیں کیا جا رہا ہے کہ تم کدھر پھرے جا رہے ہو بلکہ یہ ہے کہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی ایسا گمراہ کن شخص یا گروہ موجود ہے جو لوگوں کو غلط رخ پر پھیر رہا ہے۔ یہ طرز سوال جگہ جگہ ایسے مواقع پر قرآن میں اختیار کیا گیا ہے اور ہر جگہ گمراہ کرنے والوں کا نام لینے کے بجائے ان کو صیغہ مجہول کے پردے میں چھپا دیا گیا ہے تا کہ ان کے معتقدین ٹھنڈے دل سے اپنے معاملے پر غور کر سکیں اور کسی کو یہ کہہ کر اشتعال دلانے کا اور ان کا دماغی توازن بگاڑ دینے کا موقع نہ ملے کہ دیکھو، یہ تمھارے بزرگ اور پیشواؤں پر چوٹیں کی جا رہی ہیں" (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۲۸۲)۔

معروضی طرز استدلال، حکمت عملی کے تقاضوں میں ایک اہم تقاضا ہے جس کے ذریعے ایک طرف داعی کے حلم و بردباری اور ذہانت و فطانت سے متعلق احساسات و تاثرات مدعو کے صفحہ دل پر نقش ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف مخاصمت و چپقلش کے بغیر مخاطب کو اپنا حلیف و ہمنوا بنا لیا جاتا ہے۔ داعی کو ایسے انداز سے گریز کرنا چاہیے جس سے مخاطب کے دل و دماغ پر یہ نقش قائم ہو کہ داعی ہمارا خیر خواہ نہیں بلکہ معاند و مخالف ہے۔ اس انداز دعوت سے اجتناب کرتے ہوئے اپنی دعوت میں انتہائی دلنشیں انداز پیدا کرنا چاہیے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ہمارے اس معروضی طرز استدلال اور مثبت انداز کا اثر یہ ہو کہ جو بات مدعو کے گوش گزار کی جا رہی تھی، وہ اس کی زبان پر بے ساختہ آ جائے یا کم از کم سوچنے پر مجبور ہو جائے۔

قرآن کریم میں انبیا کی دعوتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے ہر پیغمبر نے معروضی طرز استدلال کو دعوت کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا اور قوم سے خطاب کے وقت اس کو کبھی نظرانداز نہیں کیا۔

حکمت عملی کے اس پہلو کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داعیانہ زندگی میں نمایاں طور سے ملتی ہے۔ وقت کا بادشاہ نمرود خدائی کے زعم میں گرفتار ہو کر خلیلؑ اللہ اور ان کی دعوت حق کو ناکام کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر بادشاہ وقت، داعیِ اعظم سے پوچھتا ہے کہ تمہارا رب کون ہے؟ حضرت ابراہیمؑ فرماتے ہیں کہ جس ہستی کے قبضہ قدرت میں موت و حیات کے فیصلے ہیں، دراصل وہی ہستی رب کہے جانے کے لائق ہے۔ نمرود نے خدائی کے نشے میں بدمست ہو کر کہا کہ مارنا اور جلانا میرے ہاتھ میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم مجھے رب مانتے ہو۔ اللہ کی کتاب بتاتی ہے کہ آپ نمرود کے اس باغیانہ اظہار پر برانگیختہ نہیں ہوئے۔ دعوت پیش کرنے کا یہ زریں موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا اور انتہائی متانت کے ساتھ کہا: "ٹھیک ہے، تم بھی مارتے اور جلاتے ہو، لیکن میرا رب سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے۔ کیا تو اپنی خدائی کے ثبوت میں اسے مغرب سے طلوع کرا سکتا ہے؟ اگر تم اس پر قادر ہو تو خدائی تسلیم کر لی جائے گی"۔ منکر حق اس پر زور استدلال کی تاب نہ لا سکا اور وہ سراپا استعجاب بن گیا۔ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ - قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ - قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ (البقرہ ۲:۲۵۸)، "جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے، تو اس نے جواب دیا: زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا: اچھا، اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا۔ یہ سن کر وہ منکر حق ششدر رہ گیا"۔

قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم خدا کی خدائی کا انکار کرنے والوں میں سے نہیں تھی، ہاں خدائے واحد کے علاوہ دوسرے معبودان باطل کو بھی اپنی بندگی کا مستحق سمجھتی تھی یعنی شرک اس قوم کے رگ و ریشے میں سرایت کر گیا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ عقل و فطرت کی روشنی میں جب ایک خدا کی خدائی کو سمجھ گئے تو شرک و بت پرستی میں ملوث قوم کے بتوں کو خاطر میں لائے بغیر بڑی جرات و بے باکی کے ساتھ معبودان باطل کی بے بضاعتی بیان کی۔ آپ نے قوم کو بتایا کہ تم فی الحقیقت رب حقیقی کی ربوبیت اور معبود مطلق کی عبادت میں کسی اور کو شریک کر کے سنگین جرم کا ارتکاب کر رہے ہو، حالانکہ جن لوگوں کو تم نے شرکا کا درجہ دے رکھا ہے، انھیں اللہ یا اس کے رسول نے کوئی سند نہیں دی ہے۔ جہاں تک رہا میرا معاملہ تو میں نے معبود حقیقی کی رضا کو اپنی زندگی کا مقصد مانا ہے۔ اس آئینے میں حقیقت حال کا مشاہدہ کرو اور سمجھو کہ اللہ رب العزت کی عطا کردہ سکینت و طمانیت کی نعمت بیش بہا کا فی الواقع مستحق کون ہے۔ اس براہیمی طریقہ استدلال کو اللہ کی کتاب یوں بیان کرتی ہے: وَكَیْفَ اَخَافُ مَا اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا - فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (الانعام ۶:۸۱)، "اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جبکہ تم اللہ کے ساتھ ان

چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ ہم دونوں فریقوں میں کون زیادہ بے خوفی و اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو"۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی داعیانہ سیرت مبارکہ میں یہ پہلو اور بھی نمایاں طریقے سے سامنے آتا ہے کہ آپؐ نے دعوت حق کی ترویج و اشاعت میں کوئی ایسا طریقہ نہیں اختیار کیا جس سے مخاطب کی عزت نفس پر آنچ آئے۔ داعی اگر حکمت سے مالا مال ہو تو دعوت میں کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔ داعی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت دعوت کی بے شمار مثالیں قرآن کے صفحات میں قیمتی موتیوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔

قرآن کے اول مخاطب اہل مکہ تھے اور ان میں بھی وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ کے تحت قریش مکہ کو حضورؐ کی دعوت کے مخاطب اول ہونے کا شرف حاصل تھا لیکن ان لوگوں نے ہی قرآن اور صاحب قرآنؐ کو سب سے زیادہ اپنی اوچھی حرکتوں کا نشانہ بنایا۔ قرآن کو سحر اور شاعری کہا اور صاحب قرآن کو شاعر و ساحر۔ تکذیب نبوت کے لیے انسانی کلام اور من گھڑت افسانہ کہنے سے بھی گریز نہیں کیا (الفرقان ۲۵:۴-۵)۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور صاحب قرآنؐ سے متعلق کفار و مشرکین کے اعتراضات پر گرفت کی اور اپنے رسولؐ سے کہلوا دیا کہ اگر وہ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو وہ ایسی ہی کتاب پیش کر دیں (بنی اسرائیل ۱۷:۸۸)۔ ایک داعی کو دعوت کے اس مرحلے میں جبکہ طرح طرح کے اختلافات و اعتراضات سامنے لائے جا رہے ہوں، کس طرز استدلال سے کام لینا چاہیے اور مخاطب کو کس حکمت عملی کے تحت مسکت جواب دینا چاہیے، وحی الٰہی کے مطابق نبی کریمؐ کے اس جواب میں ایک بہترین نمونہ ملتا ہے۔ واضح رہے کہ حکمت کے تحت آغاز ہی میں جھوٹ اور بے بنیاد کہہ کر مخاطب کے جذبات کو مجروح نہیں کیا گیا اور یہ تاثر نہیں چھوڑا گیا کہ داعی فریق مخالف ہے جو مدعو سے تصادم کا طلب گار ہے بلکہ اس انداز جواب سے مدعو کو یہ تاثر دیا گیا کہ داعی حقیقت پسندی اور ہمدردی و محبت کا خوگر ہے اور مدعو کا صداقت سے انکار و انحراف اس پر شاق گزرتا ہے۔ ایک پوری کتاب پیش کرنے کے مطالبے کے بعد مخاطبین کو بالترتیب دس سورتیں یا اس جیسی ایک ہی سورۃ اپنے دعوے کی صداقت میں پیش کرنے کا مطالبہ دعوت کی عظمت کو مزید معنی خیز بنا دیتا ہے۔ (ھود ۱۱:۱۳، یونس ۱۰:۳۸)

مدعو کی جانب سے حائل کی گئی مصائب و مشکلات کی وادیوں کو حسن سلوک اور عمل خیر سے سر کرنا اور انتقام سے احتراز کرنا، حکمت عملی کے باب میں ایک اور اہم اصول ہے جو داعی اور مدعو کے باہمی رشتوں کو خوشگوار بناتا ہے۔ اگر مخاطب اپنے آبا و اجداد کے دین کے خلاف داعی کی بات تک سننا گوارا نہیں کرتا، اسے طنز و تعریض کا نشانہ بناتا ہے اور بعض اوقات اس کی کامیابی کی راہ میں روڑے اٹکاتا ہے تو یہ مراحل بلاشبہ ناخوشگوار اور صبر آزما ہوا کرتے ہیں۔ لیکن داعی کو دعوت کی راہ میں ان پیش آمدہ مصائب و مشکلات کو

انگیز کرنا چاہیے، اس یقین کے ساتھ کہ وہ اللہ کے مقدس مشن کو دنیائے انسانیت تک پہنچانے میں لگا ہوا ہے۔ اسے اپنی طرف سے اوچھے پن کا ثبوت نہیں دینا چاہیے اور نہ ہی مخاطب کی بدسلوکیوں پر مشتعل ہو کر انتقامی جذبات کے ساتھ اسے بھی تکلیف پہنچانے پر آمادہ ہو جانا چاہیے۔ انتقامی کارروائی محض مخاطب کے ساتھ ایک انتقامی کارروائی ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کی وجہ سے مخاطب کے دعوت حق سے متنفر ہونے کے خدشات بڑھ جاتے ہیں اور معاشرے کے دیگر افراد کی نگاہوں میں داعی، دعوت اور مدعو کے درمیان مختلف قسم کے شکوک و شبہات حائل ہو جاتے ہیں۔ قرآن کا فلسفہ یہ ہے کہ اگر دلوں کی دنیا پر حکمرانی کرتے ہوئے مدعو کو اپنا حلیف و ہمنوا بنانا ہو تو اس کی شرپسندی کا جواب محبت اور خیرسگالی سے دینا چاہیے اور سیئات و منکرات کا قلعہ خیرات و حسنات کے ذریعے فتح کرنا چاہیے۔ کتاب اللہ دعوت سے متعلق اسی فلسفے کی تلقین کرتی نظر آتی ہے۔ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۔ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ (حم السجدہ ۴۱:۳۴) "اور اے نبیؐ" نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی، وہ جگری دوست بن گیا ہے"۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام خطہ ہائے عالم اور تمام شعبہ ہائے زندگی کے لیے مکمل اسوہ ہیں۔ انتقام سے پاک جذبات اور عفو عام کی جو معجزانہ مثال ہمیں سیرت طیبہؐ میں ملتی ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی حکمران قوم، کسی قائد تحریک اور کسی امیر جماعت میں نظر نہیں آتا ہے۔ دعوت و تبلیغ کی پرخار وادیوں سے گزرتے ہوئے آپؐ کفار و مشرکین کے انتہائی مذموم اور معاندانہ سازشوں کا نشانہ بنے۔ آپؐ کے اخلاص و للہیت پر طنز کیا گیا اور اسے شکوک و شبہات کا ہدف بنایا گیا۔ حرص و طمع کے دام میں گرفتار کرنے کے لیے سطحی اور اوچھی سازشیں رچائی گئیں، وحدت الہ کا علم بلند کرنے اور دعوت حق کے فروغ و اشاعت کی جدوجہد کے جرم میں آپؐ کو شعب ابی طالب میں قیدی بنایا گیا اور حقہ پانی بند کر دیا گیا۔ اللہ کے اس محبوب ترین بندے کے ساتھ خود اللہ کے گھر میں گستاخانہ اور اخلاق سوز حرکتیں کی گئیں اور بلاشبہ انسانیت کی پیشانی پر یہ کلنک کا ٹیکہ ہے کہ پیغمبرؐ وقت اور محبوبؐ خدا کے ساتھ دیار طائف میں انتہائی سفاکانہ اور انسانیت سوز حرکتیں کی گئیں۔ ہادی اعظمؐ کا مقدس خون صرف اس بنا پر طائف کی سرزمین پر ٹپکا کہ آپؐ بھٹکی ہوئی انسانیت کو ہدایت کی شاہراہ دکھلا رہے تھے۔ آپؐ نے ان تمام نامساعد احوال میں نہ صرف یہ کہ انتقام سے گریز کیا بلکہ رشد و ہدایت کی دعائیں کیں اور عفو و درگزر کا پروانہ عام دے دیا۔ طائف میں ہادی اعظمؐ کے ساتھ وحشیانہ سلوک کے نتیجے میں پہاڑوں کے منتظم فرشتے کا نزول اور اہل طائف کو بھس بنا دینے کی پیش کش اور اس پر رحمت عالمؐ کی رحیمانہ شان کا مظاہرہ اور فتح مکہ کے موقع پر آپؐ کے قتل کی سازشیں کرنے

والوں' صحابہ کرامؓ کو گرم گرم ریت پر لٹا کر ان کے سینوں پر پتھر رکھنے والوں' دعوت حق اور اس کے علم برداروں کو زک پہنچانے والوں اور سالہا سال تک حق و باطل کی کش مکش میں نبرد آزما ہونے والوں اور بدر و حنین و خیبر و خندق میں امامت و پیشوائی کا علم اٹھانے والوں کے' خانہ کعبہ کے صحن میں سرنگوں کھڑے ہونے کے باوجود' آپؐ نے عفو و درگزر اور رحم و کرم کے جس عظیم الشان اور معجزانہ کردار کا مظاہرہ کیا' تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔

اللہ رب العزت کی عطا کردہ عظیم ترین نعمت اسلام کو بلافرق و امتیاز پوری انسانیت تک پہنچانا امت کے ہر ہر فرد کا فرض منصبی ہے۔ اپنی صلاحیت و لیاقت کے مطابق ہر فرد امت اس مقدس مشن کا پیامی ہے۔ دعوت و تبلیغ ہی امت مسلمہ کی شناخت اور اس کی اصل روح ہے جس کے بغیر امت ایک بے روح جسم ہے۔ اللہ کے دین سے لوگوں کو روشناس کرانا' معروفات کی ترغیب اور اس کے فروغ کی جدوجہد نیز منکرات سے نفرت دلانا اور ان سے احتراز و اجتناب کی دعوت' انتہائی مبارک عمل اور انبیا کرامؑ کی عظیم ترین سنت ہے۔ اس راہ میں جبر و اکراہ' دعوت کی عظمت اور داعی کی شان کے خلاف ہے۔ دعوت کے اس انتہائی مقدس سفر میں تعلق باللہ' اخلاص و للٰہیت' صبر و استقامت' ہٹ دھرموں سے اعراض اور توبہ و استغفار' زاد راہ ثابت ہوتے ہیں اور دوسری طرف یہ داعی کی بے لوث شخصیت کو میدان عمل میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ داعی حق کی مثالی زندگی میں حکمت عملی ایک گراں قدر دولت ہے۔ مخاطب کو اس کی زبان میں دعوت' اس کی نفسیات کا لحاظ' شیریں کلامی' معروضی طرز استدلال' انتقام سے احتراز اور عفو و درگزر کا سلوک' وہ عناصر ہیں جن سے داعی کی شخصیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ دریا کی کوئی طغیانی' سمندر کی کوئی لہر اور ہواوں کا کوئی جھونکا اس کے پایہ استقامت میں لغزش نہیں لا سکتا۔ دعوت حق کی عظمت و تقدیس کے نقوش مخاطبین کے دل و دماغ پر ثبت ہو جاتے ہیں اور بالآخر شبانہ روز جدوجہد رنگ لاتی ہے اور پھر خدا کی یہ زمین مادی اور روحانی فیوض و برکات سے معمور ہو کر جنت نشاں بن جاتی ہے۔

اہم گذارش : ترجمان القرآن میں اشتہار دینے والے اداروں یا افراد سے معاملات میں کوئی نقصان ہو تو ترجمان القرآن کے نمایندے اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ قارئین کو چاہیے کہ کوئی معاملہ کرنے سے پہلے تحقیقات کریں اور اپنی ذمہ داری پر معاملہ کریں۔